حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم
نائب رئیس الجامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(تیسری قسط)

بھائی جان (حضرت محمد زکی کیفی، رحمۃ اللہ علیہ) کے بارے میں چند مزید خصوصیات کا تذکرہ کئے بغیر بات مکمل نہیں ہوگی۔ خصوصاً یہ بات کہ ہم بھائیوں میں یہ سعادت صرف بھائی جان ہی کے حصے میں آئی کہ انہوں نے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، قدس سرہ، کی خدمت وصحبت بلکہ بیعت کا شرف بھی حاصل کیا، حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، انہیں ہر سال تھانہ بھون ساتھ لے جاتے تھے، اور حضرت تھانوی، رحمۃ اللہ علیہ، ان سے بہت محبت فرماتے تھے، بارہا حضرت نے انہیں سر کی مالش کرنے کا موقع دیا۔ حضرتؒ پان کھانے کے عادی نہیں تھے، لیکن کھانے کے بعد بغیر کتھے چونے کا سادہ پتہ کبھی کبھی تناول فرمالیا کرتے تھے۔ بھائی جان اکثر ان کو بروقت پان پیش کردیتے تھے، اس لئے حضرت نے ازراہِ مزاح ان کا نام "پانی" رکھا ہوا تھا۔ جب پان کی ضرورت ہوتی اور بھائی جان پاس نہ ہوتے تو فرماتے، "وہ ہمارا پانی کہاں گیا"؟ ایک بہت بڑی سعادت انہیں یہ حاصل ہوئی کہ ایک روز انہوں نے حضرت سے درخواست کی کہ "مجھے پند نامہ عطار پڑھا دیجئے"۔ حضرت، رحمۃ اللہ علیہ، کے پاس اتنا وقت کہاں تھا کہ وہ کسی بچے کو پند نامہ پڑھائیں لیکن بھائی جان پر غیر معمولی شفقت ومحبت کے پیش نظر آپ نے اس معصومانہ درخواست کو ٹھکرانا پسند نہیں فرمایا اور جواب دیا کہ "اور تو میرے پاس کوئی وقت نہیں ہے لیکن عصر کے بعد میں ہوا خوری کے لئے جاتا ہوں، اس وقت کتاب لے کر میرے ساتھ چلا کرو میں اس فرصت میں تمہیں پند نامہ پڑھا دوں گا"۔

چنانچہ عصر کے بعد بھائی جان کتاب لے کر پہنچ گئے اور درس شروع ہوگیا۔ اس وقت حضرت کے اکابر خلفاء بھی موجود تھے، انہیں اطلاع ہوئی تو انہیں بڑا رشک آیا۔ اور انہوں نے بھی اس درس میں شامل ہونے کی اجازت چاہی۔ حضرتؒ نے اجازت دیدی اس کے بعد اس پر کیف درس میں حضرت

والد صاحبؒ، حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ، حضرت مولانا خیر محمد صاحبؒ اور حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحبؒ بھی شامل ہوگئے اور یہ درس رمضان بھر میں جاری رہا۔ حضرت مفتی محمد حسن صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، بھائی جان سے اکثر اس واقعہ کا ذکر فرمایا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ "تم تو ہمارے ہم سبق ہو اور تمہارے طفیل ہمیں حضرتؒ سے پند نامہ پڑھنے کی سعادت ملی ہے"۔

بھائی جان نے جب بچپن میں لکھنا سیکھا تو حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے ان سے سب سے پہلا خط حضرت حکیم الامت، رحمۃ اللہ علیہ، کے نام لکھوایا۔ اس خط کا جو جواب حضرتؒ نے مرحمت فرمایا وہ ایک مستقل سبق بھی ہے اور بھائی جان کے لئے ایک عظیم سرمایۂ سعادت بھی۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ: "برخوردار سلمہ السلام علیکم مع الدعا، تمہارے حروف دیکھ کر دل خوش ہوا۔ تمہاری علمی وعملی ترقی کی دعا کرتا ہوں۔ خط ذرا اور صاف کرلو، اس سے مکتوب الیہ کو بھی سہولت وراحت ہوتی ہے اس نیت سے ثواب بھی ملتا ہے۔ دیکھو! میں تم کو بچپن سے صوفی بنا رہا ہوں، دردسر کا یہ تعویذ سر میں باندھ لو، سب گھر والوں کو سلام ودعا۔ اشرف علی"۔

عام لوگ سوچیں گے کہ خط صاف کرنے کا تصوّف سے کیا واسطہ؟ لیکن یہ حکیم الامت حضرت تھانوی، رحمۃ اللہ علیہ، کی خصوصیت تھی کہ انہوں نے شریعت وطریقت کے اہم ترین تقاضوں یعنی آداب معاشرت، اخلاق اور صفائی معاملات کی طرف اپنے متعلقین کو اس وقت بطور خاص متوجہ فرمایا جب دین کے ان شعبوں کو دین سے خارج سمجھ لیا گیا تھا، اور اوراد ووظائف یا نوافل میں سستی پر حضرتؒ نے کبھی عتاب نہیں فرمایا، لیکن اگر کوئی شخص آداب معاشرت یا معاملات وغیرہ میں کوتاہی یا ایسا کام کرتا جس سے دوسروں کو تکلیف پہنچے تو اس پر سخت گرفت فرماتے تھے۔

حضرتؒ کی اسی تعلیم وتربیت کا اثر تھا کہ بھائی جان ہمیشہ اپنی نقل وحرکت میں اس بات کا خاص اہتمام کرتے تھے کہ اس سے کسی دوسرے کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

حضرت حکیم الامتؒ سے بھائی جان کے بیعت ہونے کا واقعہ بھی عجیب ہے۔ بھائی جان اس وقت تک نابالغ تھے، حضرتؒ کی شفقتوں اور عنایتوں کو دیکھتے ہوئے انہوں نے ایک دن خود ہی حضرتؒ سے بیعت کی درخواست کی۔ حضرت عموماً بلوغ سے پہلے بیعت نہیں فرماتے تھے، اس لئے ازراہ خوش طبعی فرمایا

کہ بیعت خالی ہاتھ تھوڑے ہی ہوتے ہیں، امرود لے کر آؤ تو بیعت کریں۔ وہ موسم ایسا تھا کہ بازار میں امرود نہیں آرہے تھے، اس لئے حضرتؒ نے یہ بات انہیں ٹالنے کے لئے فرمائی تھی اور خیال یہ تھا کہ اس موسم میں وہ امرود نہیں لاسکیں گے۔ لیکن بھائی جان نہ جانے کہاں سے تلاش کر کے امرود لے آئے؟ حضرتؒ نے دیکھا تو بڑا تعجب ہوا اور چونکہ وعدہ فرما چکے تھے اس لئے بیعت کے لئے راضی ہوگئے۔ لیکن حضرتؒ کے برابر شرعی احکام کی رعایت کون کرے گا؟ بھائی جان اس وقت نابالغ تھے اور نابالغ سے ہدیہ قبول کرنا والدین کی اجازت کے بغیر شرعاً جائز نہیں تھا، اس لئے بھائی جان کو واپس بھیجا کہ جا کر اپنے والدین سے پوچھ کر آؤ، بھائی جان اجازت لے آئے، تو اس کے بعد بیعت فرمایا۔

اس واقعہ کے بعد ۷ر ربیع الثانی ۱۳۵۶ھ کو حضرت والد صاحب مدظلہم نے حضرت حکیم الامت کے نام ایک خط تحریر فرمایا جس میں لکھا کہ:

"محمد زکی سلمہ کے لئے الحمدللہ مرید ہونے کی کھلی ہوئی برکت ظاہر ہوئی کہ نماز کا بہت ہی شوق ہوگیا، عشاء کی نماز کے وقت پہلے سو جاتا تھا اب بیٹھا ہوا انتظار کرتا رہتا ہے"۔

حضرت حکیم الامتؒ نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

"ماشاءاللہ! دعا کیجئے مجھ کو بھی اس بے گناہ بچے کی برکت نصیب ہو اور ہمت عمل اور استقامت واخلاص عطا ہو"۔

بھائی جان کے بچپن کے بہت سے معاملات حضرت حکیم الامتؒ ہی کے مشوروں سے انجام پائے۔ ۱۰ر رجب ۱۳۵۵ھ کے مکتوب میں حضرت والد صاحبؒ نے حضرت تھانویؒ کو لکھا:

"محمد زکی سلمہ سال بھر سے زائد ہوا کہ اس کو حفظ قرآن مجید شروع کرادیا تھا مگر کچھ عرصہ چھ ماہ سے وہ بیمار چلا جاتا ہے۔۔۔اب بعض اقرباء کا مشورہ یہ ہے کہ حفظ قرآن کی محنت یہ برداشت نہیں کرسکتا۔۔۔سخت تردد میں ہوں، کیا کروں"۔

حضرتؒ نے جواب دیا:

"اگر زکی میرا بچہ ہوتا تو حفظ چھڑا دیتا، پھر جب کسی موقع پر قوت ہوتی (گو بعد فراغ درسیات سہی) پھر تکمیل کرا دیتا۔ اس وقت بہت سہولت ہوجاتی ہے"۔

اس طرح بھائی جان اٹھارہ سال کی عمر تک حضرت حکیم الامت ، رحمۃ اللہ علیہ ، کی ہدایات اور عنایات سے فیضیاب ہوتے رہے۔ اسی دوران حضرت والد صاحبؒ کو ایک مرتبہ ایک خط حضرت تھانویؒ کے پاس تھانہ بھون بھیجنا تھا۔ والد صاحب چاہتے تھے کہ یہ خط آج ہی حضرتؒ کو پہنچ جائے۔ ادھر سہارنپور سے تھانہ بھون جانے والی گاڑی میں سفر کا کوئی امکان نہیں رہا تھا۔ بھائی جان نے یہ خدمت اپنے ذمہ لی، دیوبند سے مظفر نگر اور مظفر نگر سے شاملی پہنچے، خیال تھا کہ شاملی سے تھانہ بھون جانے والی گاڑی مل جائے گی، مگر شاملی پہنچے تو گاڑی نکل چکی تھی۔ بھائی جان نے وہاں سے ایک سائیکل کرائے پر لی اور شاملی سے تھانہ بھون تک کا طویل راستہ اسی سائیکل پر طے کرکے مکتوب بروقت حضرتؒ کو پہنچادیا۔

حضرت تھانویؒ کے علاوہ دیوبند میں حضرت میاں صاحبؒ (حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ) بھی بھائی جان سے نہایت شفقت فرماتے تھے، اور بھائی جان کو ان کی خدمت وصحبت کا بھی خوب خوب موقع ملا۔ انہیں بچپن ہی سے بزرگوں سے فیضیاب ہونے اور ان کی خدمت وصحبت سے فائدہ اٹھانے کا خاص ذوق تھا اور اس لحاظ سے انہیں یہ شعر کہنے کا واقعی حق پہنچتا تھا کہ ؎

اس وقت سے میں تیرا پرستار حسن ہوں
دل کو مرے شعور محبت بھی جب نہ تھا

اور بزرگوں کی اسی صحبت کا اثر تھا کہ ان پر دین اور فہم دین کا ایک ایسا پختہ رنگ چڑھا ہوا محسوس ہوتا تھا جو کسی ماحول میں کبھی مغلوب یا مرعوب نہیں ہوا، وہ جس ماحول میں رہے ہمیشہ اچھا رنگ دوسروں پر چھوڑ کر آئے ؎

رنگیں ہے ہم سے قصہ مہر و وفا کہ ہم
اپنی وفا کا رنگ ترے رخ پر مل گئے

چوتھے نمبر پر ہماری بہن حسیبہ خاتون [1] (رحمہا اللہ تعالیٰ) تھیں جنہیں ہم "بی جان" کہتے

(۱) ان کی وفات پر میں نے البلاغ میں ان کا تذکرہ قدرے تفصیل کے ساتھ کیا ہے جو میری کتاب "نقوش رفتگاں" میں شائع ہو چکا ہے۔

تھے۔اور پانچویں نمبر پر محترمہ رقیبہ خاتون صاحبہ مدظلہا جنکو ہم چھوٹی آپا کہتے ہیں۔عمر میں یہ دونوں بھی مجھ سے کافی بڑی تھیں لیکن اُس وقت غیر شادی شدہ تھیں اور انہوں نے شروع ہی سے ہمیں اپنے ساتھ اتنا بے تکلف کیا ہوا تھا کہ عمر کے بڑے تفاوت کے باوجود ان سے ہمیشہ دوستی کا سا رشتہ قائم رہا۔ان بہنوں کی بھی تعلیم کی کل کائنات پھوپی امۃ الحنان صاحبہ کے مکتب (جس کا ذکر میں ان شاء اللہ آگے کروں گا) اور گھریلو طور پر "بہشتی زیور" کی حد تک محدود تھی،لیکن حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کے حسن تربیت کے نتیجے میں ان کا علمی اور ادبی ذوق یقیناً یونیورسٹیوں کی پڑھی ہوئی خواتین سے بھی زیادہ تھا۔ان کا مطالعہ بھی وسیع تھا اور نہ صرف یہ کہ سخن فہمی کی صلاحیت غیر معمولی تھی بلکہ وہ خود اعلیٰ درجے کے شعر کہتی تھیں۔محض نمونے کیلئے ان میں سے بڑی بہن محترمہ حسیبہ خاتون مرحومہ کے یہ شعر ملاحظہ فرمایئے:

ہمیں تو آتا ہے رونا مآلِ گلشن پر
بھلا یہ ہنستے ہیں کیوں گلستاں، نہیں معلوم

گذر رہی ہیں نشیمن سے بے سلام و پیام
خفا خفا سی ہیں کیوں بجلیاں نہیں معلوم

اور محترمہ رقیبہ خاتون صاحبہ مدظلہا کے یہ شعر:

ضبطِ غم پر بھی ڈبڈبا ہی گئی
آنکھ دل سے شکست کھا ہی گئی

سنتے سنتے مرا فسانۂ غم
چاند تاروں کو نیند آ ہی گئی

اس چھوٹی سی عمر میں میرے گھر کے زیادہ تر اوقات انہی دو بہنوں کے ساتھ گذرتے تھے، کیونکہ کپڑے بدلنے سے لیکر میرے ناز نخرے اٹھانے تک یہی میری دیکھ بھال پر مامور تھیں، اس لئے ان کی صحبت نے بچپن کے اسی ابتدائی زمانے میں مجھ میں ادبی ذوق کا بیج ڈال دیا تھا جس کا کچھ مزید حال میں ان شاء اللہ تعالیٰ آگے ذکر کروں گا۔

ان کے بعد جناب محمد رضی عثمانی صاحب (رحمہ اللہ تعالی) تھے جو اُس وقت دارالعلوم دیوبند کے درجۂ فارسی میں پڑھتے تھے۔ وہ طبعی طور پر بچوں سے نہ صرف بہت محبت کرتے تھے بلکہ ان کی نفسیات کی باریکیوں سے بھی خوب واقف تھے۔ انہوں نے مجھے بہت سر چڑھا رکھا تھا، اور میری ہر خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ہم تین چھوٹے بھائی اُنہیں "بھائی رضی" کہتے تھے، اور اُس وقت میں اپنی تتلائی ہوئی زبان میں "بھائی لجی"! لیکن اگر کسی وقت وہ میرا کوئی مطالبہ پورا نہ کرسکتے، تو میں اُن سے ناراضی کا برملا اس طرح اظہار بھی کردیتا تھا کہ اُنہیں خطاب کرتے ہوے بھائی کا لفظ حذف کرکے براہ راست اُن کا نام لے لیتا، اور غصے کے لہجے میں کہتا: "لجی"!۔

اُنہیں ایک مرتبہ یہ معلوم ہوگیا کہ میں کبوتر دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہوں۔ اُن کے ایک دوست نے جو حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی، رحمہ اللہ علیہ، کے بھتیجے تھے، کبوتر پال رکھے تھے، بھائی صاحب نے شاید اُن سے فرمائش کی ہوگی کہ وہ میرے لئے بھی ایک کبوتر لے آئیں۔ چنانچہ ایک دن وہ اپنے ہاتھ میں کبوتر لے کر دروازے پر آئے۔ بھائی صاحب مجھے لے کر خوشی خوشی دروازے پر گئے، اور میں نے جب کبوتر دیکھا، اور یہ معلوم ہوا کہ یہ میرے لئے آیا ہے تو میری خوشی کا کچھ ٹھکانا نہیں تھا، اور مجھے بچپن کی وہ خوشی اب تک یاد ہے۔

اللہ تعالیٰ بھائی صاحب کو اپنی مکمل مغفرت کا مورد بنائے۔ وہ خود بھی اُس وقت کم عمر تھے۔ کبھی کبھی مجھے خوش کرنے کیلئے وہ کاغذ پر مختلف تصویریں بناتے تھے۔ ایک مرتبہ اُنہوں نے کاغذ پر ایک امرود، ایک لیموں، ایک چڑیا، ایک گدھے اور ایک کوّے کی تصویر بنادی۔ شاید مجھے کسی طرح یہ معلوم ہوگیا تھا کہ جانوروں کی تصویر بنانے سے والد صاحبؒ ناراض ہوں گے۔ لہٰذا جب کبھی میں اُن سے ناراض ہوتا، تو ان کا نام لے کر خطاب کرتے ہوئے اُنہیں اپنی تتلائی ہوئی زبان میں کہتا: "املود، نیموں، چلیا، ددھا، توا (امرود، لیموں، چڑیا، گدھا، کوا) شاید اس میں یہ دھمکی پنہاں ہوتی تھی کہ اگر آپ نے مجھے راضی نہ کیا، تو میں والد صاحبؒ سے شکایت کردوں گا کہ انہوں نے چڑیا، گدھے اور کوّے کی تصویر بنائی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ میری گالی بن گئی اور صرف اُنہی سے نہیں بلکہ جس کسی سے مجھے کوئی ناراضگی ہوتی تو میں اُسے غصے کے لہجے میں یہی کہتا: "املود، نیموں، چلیا، ددھا، توا" یہ میری بدترین گالی تھی جو میں کسی

بچے سے لڑائی کے دوران اُس کو دیا کرتا تھا۔

اللہ تعالیٰ بھائی رضی صاحب پر اپنی مغفرت ورضوان کی بارش برسائے، مجھ سے ان کے عشق کا عالم یہ تھا کہ جب حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کو شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، قدس سرہ، کی جگہ بخاری شریف پڑھانے کے لئے دارالعلوم ڈابھیل بلایا گیا، تو حضرت والد صاحبؒ انہیں بھی اپنے ساتھ ڈابھیل لے گئے۔ ڈابھیل میں کئی مہینے قیام رہا۔ اس دوران وہ میری یاد میں بہت افسردہ رہتے اور انہوں نے "البلاغ" میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر جو مضمون لکھا ہے اُس میں وہ لکھتے ہیں:

> احقر ان دنوں قرآن کریم ناظرہ پڑھتا تھا، اور وہیں درجۂ قرآن میں داخلہ لے لیا تھا۔ مدرسے سے چھٹی کے بعد اکثر خاموش خاموش رہتا تھا۔ نہ کھانے میں دل تھا، اور نہ کسی اور کام میں۔ اور اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ آج کے مولانا محمد تقی عثمانی مدیر البلاغ اُس وقت دو یا اڑھائی سال کے تھے، اور احقر کو ان سے اس قدر محبت اور تعلق خاطر تھا کہ دیوبند میں ایک گھنٹہ بھی اُس سے علیحدہ رہنا شاق گذرتا تھا، چنانچہ ڈابھیل میں بھی ہر وقت بس وہی یاد آتے رہتے اور جب کوئی اور بس نہ چلتا تو مدرسے کے درودیوار پر اُن کا نام لکھتا رہتا تھا۔ (مفتیٔ اعظم نمبر۲: ۱۰۴۴)

بھائی صاحب کی ایک بڑی قربانی یہ تھی کہ پاکستان ہجرت کے بعد ہم سب بھائی تو چھوٹے تھے، اور حضرت والد صاحبؒ کا ہاتھ نہیں بٹا سکتے تھے، وہی تنہا ایسی عمر میں تھے کہ کسی معاشی سرگرمی میں ان کے کام آسکیں، چنانچہ وہ ابتدائی تعلیم کے بعد والد صاحبؒ کے تجارتی کتب خانے دارالاشاعت کے ناظم بن کر اسی کے لئے وقف ہوگئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تعلیم آگے جاری نہ رکھ سکے، لیکن اپنے مطالعے کے ذوق سے بفضلہٖ تعالیٰ انہوں نے اپنی معلومات میں اضافے کا سلسلہ آخر وقت تک جاری رکھا، اور عملی زندگی میں وہ دینی معلومات کے اعتبار سے بھی بہت سوں کے لئے قابل رشک تھے۔ حرمین شریفین کی حاضری کا بڑا ذوق تھا، اور تقریباً ہر سال نہایت والہیت کے ساتھ حج یا عمرے کے لئے جانے کا معمول تھا۔

پھر ساتویں نمبر پر جناب محمد ولی رازی صاحب مدظلہم ہیں وہ دارالعلوم دیوبند میں قرآن کریم حفظ کررہے تھے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے ذہانت وفطانت، حاضر جوابی اور ظرافت طبع کے خداداد اوصاف عطا

فرمائے ہیں وہ جب شعر و شاعری کے کوچے میں داخل ہوئے، تو اس میں بھی امتیاز حاصل کیا، تدریس کے شعبے میں گئے، تو کراچی گرامر اسکول اور کراچی یونی ورسٹی میں اسلامیات پڑھانے کے دوران انہوں نے بہت سے لوگوں کی زندگیاں بدلیں۔ انگریزی میں ایم اے کیا، تو اس صلاحیت سے متعدد دینی کتابوں کے انگریزی ترجمے کی خدمت انجام دی۔ "بائبل سے قرآن تک" اور مرزائیوں کے بارے میں "امت مسلمہ کا موقف" کا انگریزی ترجمہ انہی کے قلم سے ہوا ہے۔ البلاغ انگریزی اب بھی انہی کی ادارت میں نکلتا ہے۔ ان کی ذہانت وفطانت کا شاہکار ان کی تالیف "ہادیٔ عالم صلی اللہ علیہ وسلم" اب شہرۂ آفاق ہو چکی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری سیرت اس اہتمام سے لکھی ہے کہ اس میں کوئی لفظ نقطوں والا استعمال نہیں ہوا، تقریباً چار سو صفحات کی یہ سیرت نقطوں سے خالی ہے۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے کہ اسے عالمی ریکارڈ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ نقطوں کے بغیر اردو میں کوئی لمبی تحریر، خاص طور پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ لکھنا کتنا مشکل کام ہے، اس کی کچھ تفصیل میں نے اس کتاب کے مقدمے میں بیان کی ہے۔ لیکن انہوں نے اللہ تعالیٰ کی خاص توفیق سے یہ کارنامہ چند مہینوں میں انجام دیا، اور ایک ریکارڈ قائم کر دیا۔ ان کی اور بھی بہت سی کتابیں اور مضامین ان کی وسعت مطالعہ اور علمی، دینی اور ادبی ذوق کی آئینہ دار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں انتہائی متواضع اور سادگی کا پیکر بنایا ہے۔ نام ونمود سے کوسوں دور رہ کر وہ اب بھی اپنے مضامین کے ذریعے علم ودین کی خدمت انجام دیتے رہتے ہیں۔

آٹھویں نمبر پر میرے بڑے بھائی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی مدظلہم مجھ سے سات سال بڑے ہیں، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں بچپن سے آج تک اس طرح ساتھ رکھا ہے کہ نہ صرف گھر کے ماحول میں، بلکہ دینی اور ملکی حلقوں میں بھی ہم دونوں کے نام ایک ساتھ لازم وملزوم کی طرح لئے جاتے رہے ہیں۔ ہم سب بہن بھائیوں میں مجھے سب سے طویل رفاقت کا اعزاز انہی کے ساتھ حاصل ہوا جس سے میں نے بہت کچھ سیکھا، مگر طبیعت کے بے ڈھنگ انداز نے ان پر عمل کرنے میں بکثرت رکاوٹ پیدا کی، وہ نہایت منظم اور بااصول زندگی کے حامل، اور میں بدحواس اور بے ڈھنگ، وہ ہر کام اطمینان اور وقار سے کرنے کے عادی، اور میں جلد باز، ان کے گھر سے لیکر دفتر تک ہر چیز باقرینہ،

اور میں بد سلیقہ، غرض میری ان بے وقوفیوں کو انہوں نے جس صبر وضبط کے ساتھ برداشت کیا، یہ انہی کا حوصلہ ہے، یہ اختلاف طبائع جس کا قابل اعتراض حصہ یقیناً میرے بے ہنگم انداز زندگی ہی کی وجہ سے تھا، اسے ان کے تحمل اور بڑائی نے کبھی قابل ذکر ناگواری میں تبدیل ہونے نہیں دیا، اور اس میں انہی کی بڑائی کا سب سے زیادہ دخل ہے کہ تعلیم کے زمانے سے لے کر تدریس، افتاء اور پھر ملکی معاملات تک مجھے الحمد للہ تعالیٰ ان کے ساتھ تقریباً پوری ہم آہنگی کے ساتھ ان سے استفادے کا موقع ملا، اور ہمیشہ ان کی شفقت میسر آئی۔۔ علماء کرام نے انہیں حضرت مفتی ولی حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بعد "مفتیٔ اعظم پاکستان" کا لقب دیا، اور ان کی اردو عربی تصانیف، فتاویٰ اور ان کے دروس کی منضبط، واضح اور جچی تلی تقریریں اور ان کے مواعظ اس لقب کی صحت پر شاہد عدل ہیں۔ آج پاکستان میں جب سنجیدہ، صاحب رائے، معتدل اور مخلص علماء کی کوئی فہرست بنتی ہے، تو الحمد للہ ان کا نام نامی سر فہرست ہوتا ہے۔ دار العلوم کی تعمیر وترقی کے لئے انہوں نے اپنی جسمانی اور ذہنی توانائی جس طرح وقف کی، آج دار العلوم کے در و دیوار اور اس کا ایک ایک نشیب وفراز اس کی گواہی دے رہا ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ دار العلوم کی تمام عمارتیں، ایک دو کو چھوڑ کر سب براہ راست ان کی نگرانی میں بنیں، اور ان کی ایک ایک اینٹ پر انہوں نے بذات خود محنت فرمائی ہے، تو غالباً اس میں مبالغہ نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ان کا سایۂ رحمت بعافیت تمام ہم پر سلامت رکھے، وہ صرف میرے لئے نہیں، پورے خاندان اور پورے دار العلوم کے لئے ایک شفیق باپ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ملک وملت کے مقاصد میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

☆☆☆